مرسل اعظم قوم گری کی سنگلاخ وادی میں

مولانا سید غلام عسکری مرحوم

مشکل ترین کام

ہرگز مبالغہ نہ ہوگا اگر قوم گری اور ہدایت وتبلیغ کو عالم اسباب کا مشکل ترین کام قرار دیا جائے ۔ ایک بچہ جو بری عادتوں کا خوگر نہ ہوا ہو، اسے خوبیوں کا حامل انسان بنانے میں ماں باپ بلکہ پورا گھر محنت کرتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے ایسے مدرسین کی ضرورت ہوتی ہے، جو درجہ بدرجہ اس کو منازل انسانیت سے آشنا کراتے جائیں اس کے بعد بھی صرف امید ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بن سکے گا۔ یقین پھر بھی نہیں ہوتا اس کے برخلاف ایک لڑکا نالائق ہوجائے تو صرف ماں باپ، گھر اور خاندان والے، تعلیم گاہوں کے ماہرین اس کو درست کرنے میں ناکام رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایک بگڑے انسان کی تباہ کاریوں کو ملک و قانون بلکہ بین الاقوامی طاقتیں بھی نہیں روک سکتیں۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ پوری قوم کی تعلیم و تربیت، اور قومی کردار کی تعمیر کتنا مشکل کام ہے جو صرف ایک انسان (ہادی) کے سپرد کیا جاتا ہے۔ تبلیغ کی راہ میں رکاوٹوں کے طوفانی سمندر میں ہادی (نبی یا امام) ہدایت کی ہلکی پھلکی کشتی چلاتا ہے جبکہ کشتی میں نہ حکومت کا لنگر ہوتا ہے نہ دولت کا بادبان، نہ جماعت و طاقت کے پتوار ہوتے ہیں نہ سیاست و مصلحت کا دخانی انجمن اس پر مزید مشکل یہ ہوتی ہے کہ کشتی مشیت الٰہی کی راہ پر چلانا ہوتا ہے جس سے بال برابر انحراف بھی راستہ کو کھو دیتا ہے۔

ہادی یعنی نبی یا امام کو دوہری مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ایک خوف خدا کے کامل و مکمل عرفان کے سورج کے باعث ہادی پر بندگی کی کڑی دھوپ ہمہ وقت رہتی ہے دوسری طرف بگڑی قوم کی کند ذہنی، پرانی خصلتوں کا عشق بے شعور عوام کی خود فراموشی، خواص کی خود پرستی اور سبکی، خداناشناسی کا قدم قدم پر سامنا کرنا ہوتا ہے۔ سب سے بڑی دشواری ہادی کے لیے یہ ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ قومی بے راہ روی پر قابو پانا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک گمراہی کا ٹائیفائڈ قوم کی تعمیر کے بعد اقتدار کی ہوس کے باعث بار بار عود کرتا ہے اور ہر دوسرا حملہ پہلے حملہ سے سخت تر ہوتا ہے۔ جسمانی امراض میں

فالج تقریباً ناقابل علاج بیماری ہے جس سے کلی صحت ناممکن اور اس کے دوسرے حملہ سے محفوظ رہنا محال ہے مگر ہادی کو اپنی مفلوج قوم کا مکمل علاج کرنا پڑتا ہے۔ چاہے شہیدوں کا گرم گرم خون بار بار کام میں لانا پڑے۔ ''ہر انجام کو رنگ آغاز دینا'' ایک ایسا مشترک راستہ ہے جس پر قوم اور ہادی مسلسل چلتے رہتے ہیں۔ قوم ہدایت کے ہر انجام کو گمراہی کا رنگِ آغاز دیتی رہتی ہے اور ہادی گمراہی کے ہر انجام کو ہدایت کا رنگِ آغاز دیتا رہتا ہے۔

جناب آدم سے امام حسن عسکریؑ تک دین کی پوری تاریخ کا یہی ڈھرہ رہا ہے اور اس نے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کو دنیا میں آنے پر مجبور کیا اور اسی نے ایک امام کے بعد دوسرے امام کو جامِ شہادت پلوایا ہے اس نے وارث کو غیبت کے پردہ میں جانے پر مجبور کیا ہے اور انجام و آغاز کا آخری معرکہ بعد میں ظہور پیش آنے والا ہے جس کے بعد دنیا کا آخری انجام سامنے آجائے گا۔ غرضکہ کہنا صرف اتنا تھا کہ ہادی کی ذمہ داری، قوم گری، تبلیغ و ہدایت اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

ناممکن کو ممکن بنانے والا

نبوت کو معراج ہوئی جب حضور تک پہنچی آگے بڑھنے کی گنجائش نہ پاکر ''ختمِ نبوت'' کی ''معراجی قوسین'' یعنی حضور کی نبوت و ائمہ اہل بیت کی امامت پر اپنا سفر ختم کیا۔ لیکن جس طرح حضور پر نبوت ختم ہوئی اسی طرح تبلیغی مشکلات کا خاتمہ بھی حضور پر ہوا۔ وہ کون سی مشکل نہ تھی جس نے آپ کا سامنا نہ کیا ہو۔ مگر عرش جس کے زیر قدم رہا تھا مشکلات کے ہمالہ کو اس نے نہ صرف روند ڈالا بلکہ اس طرح زیر و زبر کیا کہ مشکلات حضور کے آگے پیش نہ پاسکیں۔

حضور کی بعثت چھٹی صدی عیسوی میں ہوئی جو انسانوں کی مدون تاریخ کی سب سے تاریک صدی ہے۔ اس وقت ساری دنیا پر جہالت اور غیر انسانی کردار کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر خطہ زمین اور ہر قوم انسانی پستی میں تھی۔ عرب اس تاریک دنیا کا سب سے زیادہ تاریک ترین حصہ تھا۔ نہ صرف عرب کی سرزمین پتھریلی اور ریگستانی تھی بلکہ عرب قوم کا مزاج بھی پتھریلا تھا وہ کسی صالح انقلاب کو قبول کرنا سنگین قومی جرم سمجھتے تھے اور ان کے کردار کے ریگستان کو انسانیت کے گلشن میں تبدیل کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ مگر وحی کی بارش اور ''بادیانہ زراعت'' کے ماہر اعظم کی اب تک کی محنتوں نے اس بنجر زمین میں کیسے چمن پیدا کیے وہ آج بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ عرب کو انسان بنانے کا کام جس کے سپرد کیا جاتا وہ یہی کہتا کہ مردہ کا زندہ کرنا ممکن ہو تو ہو مگر عربوں کو انسان بنانا

ناممکن ہے۔ حضور اسی ناممکن کو ممکن بنانے آئے تھے تاکہ قیامت تک پھر کبھی انسانوں کی اصلاح کو ناممکن نہ کہا جاسکے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جبکہ دنیا بہت بڑی تھی۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے ایک انسان کی عمر کافی نہ تھی بلکہ نسلوں کی عمر درکار تھی۔ ذرائع رسل و رسائل وسائل تبلیغ ونشرواشاعت اور سامان نقل وحمل بے حد کم تھے۔ اس وقت ایک عالمی انقلاب لانا کتنا دشوار تھا اس کا اندازہ آج کا انسان نہیں لگا سکتا جبکہ آج کی دنیا کا پھیلاو اتنا سمٹ گیا ہے کہ ایک دن میں نہ صرف پوری دنیا کا طائرانہ بلکہ کافی حد تک تفصیلی دورہ ممکن ہے اور ابھی نکلی آواز چند گھنٹوں میں ساری دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ سکتی ہے۔ آج انقلاب آسان ہے مگر پھر بھی حکومت و جماعت کے بے شمار وسائل کے باوجود عالمی نہیں بلکہ کسی ایک چھوٹے سے ملک کی مختصر قوم میں انقلاب لاتے ہوئے برسوں لگ جاتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ سیاسی انقلاب کے مقابلہ میں اخلاقی و کرداری انقلاب لانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اخلاقی انقلاب کچھ ایسا ہی دشوار ہے کہ حکومت اور جماعت کی طاقت رکھنے والے اس کو لانے کی ہمت بھی نہیں کرتے۔ آج جبکہ صرف ''نشہ بندی'' کے محاذ پر حکومتیں اس طرح شکست کھا چکی ہیں کہ وہ نہ صرف نشہ بندی ختم کررہی ہیں بلکہ شراب بنانے کو سرکاری صنعت کے زمرہ میں شامل کرنے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ الفاظ نہیں ملتے جن کے ذریعہ اس انسان کی تعریف کی جائے جس نے ملک و دولت اور سیاست و طاقت کے بغیر صرف نشہ بندی کے محاذ پر کامیابی حاصل نہ کی تھی بلکہ شراب جوا، زنا، سود، رقص وموسیقی غرضکہ تمام انسانی کہنہ و دیرینہ عادات بد کو بند کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی اور وہ بھی عربوں کے سنگلاخ مزاجوں میں۔ شر اور بدی کی یہ بندش صرف قانونی نہ تھی بلکہ عملی تھی۔ عہدِ حضور میں شراب حرام تھی نہ شراب کی لائسنس رکھنے والی دوکانیں تھیں اور نہ غیر قانونی شراب کی بھٹیاں تھیں۔ زنا کو حرام کیا تو زنا کاری بند ہوگئی تھی۔ زنا کے اڈے کلاکاری اور فن لطیف کی آڑ میں چھپے نہ تھے۔ نہ زنا کاری کلب اسپتال اور تعلیم و فلاح عامہ کے مرکزوں میں پناہ ڈھونڈ سکی تھی نہ شری گھروں میں بدکاری ''دست غیب'' قسم کا ذریعہ معاش بنی تھی بلکہ اسلام نے زنا کو حرام کیا تھا تو زنا کا جھنڈا اٹھانے والی قوم میں زنا کا واقعی قتل عام ہو چکا تھا۔ جوا اور سود حرام تھا تو ریس، بینکنگ، سٹہ بازی کسی بھی چور دروازے سے جوا یا سود معاشرہ میں داخل نہ ہوسکا تھا۔ جن برائیوں کو آج تک حکومتیں، قومیں، اخلاقی مصلح، سیاسی انقلابی مل کر ہزاروں سال میں نہ روک سکے ان ہی برائیوں کے تلاطم خیز طوفان و سیلاب کو ایک انسان نے اپنے پیغام کی خوبیوں اور

کردار کی طاقت کے ذریعے روک دیا تھا۔ اور شروبدی کے یاجوج ماجوج کو انسانی معاشرہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے بند سکندری سے زیادہ مضبوط اسلام کا بند بنادیا تھا۔ کاش اس بند کو نفاق کے ذریعہ کھوکھلا نہ کیا گیا ہوتا اور ملوکی خلافت کے ذریعہ اس میں شگاف نہ ڈالے گئے ہوتے تو آج اسلام کو تبلیغ کی ضرورت نہ ہوتی۔ بلکہ مسلمان قوم کے ہر فرد کی زندگی ایک دفتر تبلیغ ہوتی جسے چارو ناچار دوسری قومیں دیکھنے اور پڑھنے پر مجبو ہوتیں اور بغیر تبلیغ دوسرے از خود کلمہ پڑھتے۔ دنیا یہی ہوتی مگر زمین و آسمان بدلے ہوئے ہوتے۔ چودہ سو سال پہلے انسانیت نے یہی سنہرا خواب دیکھا تھا جو خلفاء اسلام کے ہاتھوں شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا اور آج اسلام مسلمانوں کا شاکی ہے کہ:

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

ان چند جملوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضورؐ نے کس قدر زحمتیں اٹھائیں تھیں اور کتنی محنت سے اسلام کو بارآور کیا تھا۔ خود ہی فرماتے تھے

ما اوذی نبی قط کما اوذیت (کسی نبی کو اتنے مصائب و شدائد کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنے مصائب میں نے اٹھائے ہیں) یہ بھی سوچنا ہر نبی کے محبّ کا فرض ہے کہ حضورؐ کی کتنی عظیم زحمتوں کو خلفاء اسلام نے تباہ و برباد کیا ہے۔ انسان کا شعور جب بھی مکمل ہوگا اسے احساس ہوگا کہ انسانیت کے اس عظیم سرمایہ میں کتنا خرد برد کیا گیا ہے اور جن لوگوں نے انسانی سرمایہ (اسلام) کی تباہ کاری میں حصہ لیا ہے ان کے خلاف باشعور انسانوں میں شدید اور پرازنفرت ردعمل ہونا ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔ بات کہاں سے کہاں جانکلی ورنہ مقصود صرف یہ محسوس کرانا تھا کہ حضورؐ نے عظیم مشکلات کے ہوتے ہوئے بے سروسامانی میں جو بے مثال ''عالمی انقلاب'' پیدا کیا وہ انسانی تاریخ کا سب سے عظیم شاہکار ہے۔ اور معجزات کی تاریخ میں اس سے بڑا معجزہ نہ ہوا اور نہ ہوسکے گا مشکلات پر قابو پانے کی صلاحیت کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مشکلات (۱) حضور عرب کی منتشر قوم کو اگر قومیت یا وطنیت یا قومی حکومت کے نام پر جمع کرتے تو انقلاب لانے میں آسانی تھی۔ ابوجہل، ابوسفیان، ابولہب اور ان کی جماعت جس نے حضور کو تنگ کرنے میں ننگ انسانیت بننے سے بھی شرم نہ کی وہ قومی حکومت کے نام پر مخالفت کرنے کے بجائے حضور کے گرد اس سے زیادہ دلجمعی اور یکسوئی سے جمع ہوتے جس دلجمعی سے ابوسفیان اور خالد بن ولید وغیرہ حضرت ابوبکر کے گرد قریش کی ''قبیلانہ حکومت'' کے لئے جمع ہوئے۔ مگر حضور کی مشکلات پسند

طبیعت نے سیاسی انقلاب کے بجائے ''اخلاقی انقلاب'' کا نعرہ بلند کیا۔ جس کے عوض دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں جنت کا وعدہ تھا ملک یا مال کا وعدہ نہ تھا اور اس مشکل کام کے لئے ابوجہل کے تنومند، با اثر اور پرقوت ٹولہ اور جرگہ کے بجائے حضور نے ابوذر، عمار یا سرسلمان اور ان کے ہم کردار افراد سے کام لیا۔ جو تقریباً سب کے سب مصیبتوں کے مارے، غلامی کے شکنجے میں کسے، بیچارگی اور درماندگی کے ستائے تھے۔ اب یہ حضور کی صلاحیت قوم گری تھی کہ پتھروں کو شیشوں سے توڑا۔ ظلم کو درد سے موڑا، خاروں کو پھول بنا کر چھوڑا۔ مزہ یہ ہے کہ ہاتھوں میں نہ تلوار لی اور نہ کوڑا۔

۲- نبی اور مصلح کا فرق کم لوگوں کی نظر میں ہے چنانچہ اکثر مقررین و مصنفین کو دیکھا گیا ہے کہ وہ نبی یا امام کے تعارف وتقابل کے لئے گوتم بدھ و کبیرداس وغیرہ قسم کے مصلحین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ تقابل نہ صرف ایک گھٹیا بات ہے بلکہ نبوت و امامت کے بارے میں ناواقفیت اور اپنی تاریخ و مذہب کے لئے احساس کمتری کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح سخت تنقید کے قابل یہ بات بھی ہے کہ اکثر حضرات معصومین کو غیر مسلم مشہور افراد کے تاثرات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو اپنے ''ایڈوانس'' ہونے کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اب قرآن مستشرقین کے ترجموں سے سمجھا جاتا ہے اور معصومین کی سیرتیں کارلائل، گبن، جارج جورداق کی کتابوں سے معلوم کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و معصومین کو اپنے نقطۂ نظر سے سمجھا ہے قرآن کو قرآنی نقطۂ نظر سے اور معصومین کو ان کے مقاصد و طریقہ کار کے مطابق نہیں سمجھا ہے۔ ظاہر ہے کہ خود پورے طور پر نہیں سمجھے ان سے سمجھنے والے نہ معلوم کیا سمجھ بیٹھیں گے جو چاہے کچھ بھی ہو مگر وہ نہ ہوگا جس کو سمجھنے کی کوشش انھوں نے کی تھی تنقید نیت پر نہیں ہے بلکہ گزارش ہے کہ نیک نیتی کافی نہیں ہوتی جب تک طریقۂ عمل بھی صحیح نہ ہو۔ اپنے مذہب کو غیروں سے سمجھنا دراصل اس ''مذموم ہندوستانیت'' کا نتیجہ ہے جو غلامانہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔ ایسے لوگ ہندوستان کے بنے ہوئے مال کو دیسی ہونے کی بنا پر قابل قدر نہیں سمجھتے ہیں اور وہی مال جب ''فارن'' سے آتا ہے حالانکہ ہندوستان ہی سے گیا تھا تو وہ قیمتی اور دل پسند ہوتا ہے۔ ہنسی کیسے رکے جب ہماری اعلیٰ سوسائٹی کے مجنوں ہندوستانی کھیت کے مثلاً تازہ مٹر کو بدمزہ قرار دیتے ہیں مگر جب وہی مٹر یہاں سے جاکر فارن سے پیک ہوکر آتا ہے تو اس کے بگڑے ہوئے مزے کو فارن کے مٹر کا مزہ قرار دے کر بشوق کھاتے کھلاتے ہیں اور اپنی ''صاحبیت'' کی نمائش کرتے ہیں۔ یہی مذموم بلکہ مسموم ذہنیت اب مذہب میں داخل ہورہی ہے کہ

حضرت علیؑ نے حضورؐ کے لئے کیا کیا اس سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہوتی ہے کہ عیسائی مؤرخ نے آپ کے لئے کیا کہا ہے مضمون کا یہ حصہ موضوع سے غیر متعلق ہونے کے باوجود عمداً اتنا طویل لکھا گیا تاکہ مسلح اور نبی کا فرق سمجھانے سے پہلے ناظرین کی پوری توجہ حاصل کی جاسکے۔ مصلح کے لغوی معنی پر گفتگو نہیں ہے لغوی معنی کے اعتبار سے نبی بھی مصلح ہوتا ہے بلکہ واقعی اور کامل مصلح صرف نبی یا امام ہوتا ہے بلکہ مصلح کے اصطلاحی معنی پر بحث ہے جس کی مثال میں گوتم بدھ وغیرہ کا نام آچکا ہے نبی و مصلح میں فرق یہ ہے کہ مصلح قوم میں چند نمایاں خرابیوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک یا چند کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ستی کی رسم، بیوہ کے عقد ثانی کی مخالفت شراب و جوا وغیرہ کو دور کرنے کے لئے مصلح پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن نبی جسم انسانیت کے صرف ایک یا دو نمایاں مرض کو دور کرنے نہیں آتا بلکہ پورے نظام کو امراض سے پاک کرنے اور ہر آب و ہوا میں صحتمند رکھنے کے لئے آتا ہے۔ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بغیر تعلیم گدی نشین جراح یا عطائی حکیم اپنے موروثی نسخوں سے مخصوص امراض کا علاج کرتے ہیں اور بلاشبہ ان سے بھی سماج کو فائدہ ہوتا ہے لیکن وہ پورے نظام جسم پر نظر رکھ کر علاج نہیں کرسکتے۔ اکثر ان کا علاج ایک مرض کو دور کرتے ہوئے دوسرے مرض کو پیدا بھی کردیتا ہے۔ اس کے برخلاف تعلیم یافتہ طبیب اور حاذق حکیم یا ڈاکٹر پورے جسم پر نظر رکھ کر صحت کلی کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ ان پڑھ جراح اور حکیم میں تجربہ کار کمپاؤنڈر اور مکمل سرجن میں جو فرق ہے تقریباً وہی فرق مصلح اور نبی میں ہوتا ہے۔ حضورؐ نے جہاں سیاسی انقلاب پیدا کرنا مناسب نہ جانا وہاں وہ عربوں میں کسی مخصوص اصلاحی مشن کے علمبردار بھی نہیں بنے بلکہ عالمی انقلاب کے ذریعے تمام قوموں میں انسانی کردار پیدا کرنا چاہا قومی کردار پیدا کرنا آپ کا مقصد نہ تھا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ ''قومی کردار'' سے بالاتر ''انسانی کردار'' کی ترویج کے لیے ان عربوں سے کام لیا جو ساری غیر عرب دنیا کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سوچئے کتنا مشکل مقصد تھا اور اس سے زیادہ مشکل تر تھا اس کا ذریعہ:

واللہ کہ اے رسول کاری کردی

۳۔ تبلیغ و ہدایت میں حسب ذیل چیزیں شدید رکاوٹ بنتی ہیں۔

الف: خاندان اور وطن والوں پر اثر انداز ہونا ناممکن ہے۔ وطن سے باہر اثرانداز ہوکر وطن میں بااثر ہونا سب کو آتا ہے لیکن خاندان و وطن میں با اثر ہوکر باہری دنیا پر اثرانداز ہونا بلاشبہ دنیا و دین

کے مشاہیر کی تاریخ میں صرف ''محمدی خصوصیت'' ہے۔
ب: جاہلوں کو سمجھانا اگر ناممکن نہیں تو دشوارترین کام ضرور ہے۔ حضورؐ کی بعثت یونان میں نہیں ہوئی جہاں علم و حکمت کے چراغ روشن تھے بلکہ بعثت کے وقت جو قومیں متمدن تھیں اور اپنی ایک ترقی یافتہ تہذیب رکھتی تھیں مثلاً ایران یا روم حضور وہاں کے بجائے عرب میں مبعوث ہوئے۔ جس عرب کا ذائقہ اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اسے مردہ جانور کا متعفن گوشت لذیذ ترین غذا معلوم ہوتی تھی تنگ نظری ایسی بڑھی تھی کہ دولت کی تقسیم کے خوف سے باپ بیٹی کا گلا اپنے ہاتھ سے دبا دیتا تھا ذہن اتنے مسخ تھے کہ اوہام پرستی اور شگون لینے میں عرب اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ فکر اتنی گر چکی تھی کہ خودفراموش عوام خود پرست سردار کے حوض میں دوسرے قبیلے کے اونٹ کے ایک گھونٹ پانی پی لینے پر چالیس سال تک اپنا اور اپنی نسل کا خون بہانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ پاکیزہ رشتوں پر نہیں بلکہ بدکاری پر ناز کرتے تھے۔ دشمن کا گلا کاٹنا ان کو تسکین نہ دیتا تھا بلکہ گلا کاٹ کر دشمن کا خون پیتے تھے اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ چباتے جاتے تھے۔ دشمن کے اعضا کاٹ کر ہار پہننے میں اپنی جیت سمجھتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ آج کی روشن بیسویں صدی میں اگر عراقی شاہ فیصل، نوری السعید، اور عبداللہ کی لاشوں کو سڑک پر کھینچتے ہیں اور لاشوں پر سے سواری گزارتے ہیں تو سوچئے وہ عرب جو اسلام اور زمانہ کی موجودہ ڈیڑھ ہزار سال کی ترقی سے ناآشنا تھے اور عرب کے اندر کنویں کے مینڈک بنے ہوئے تھے ان کا حال کیا ہوگا۔ ان متعفن انسانوں میں چالیس سال خاموش زندگی بسر کرنا اور ۲۳ سال میں ان کو بدل ڈالنا بس ختم المرسلین کا کام تھا جن پر علم و عمل کی تاریخ ختم ہوتی ہے۔

۴- عرب ایک قوم نہ تھے بلکہ جتنے قبیلے تھے اتنی قومیں تھیں ان کو ایک قوم بنانا نہ تھا بلکہ ان لوگوں کو ایک انسانی قوم کا حصہ بنانا تھا اور ایسا جاندار اور روشن حصہ جو باقی حصوں کو زندگی و روشنی دے۔ جن باتوں کا آج سوچنا مشکل ہے ان کو کر گزرنا کتنا مشکل تھا۔

۵- حضورؐ کے پاس نہ پریس تھا نہ اخبارات و رسائل نہ لٹریچر، نہ ایڈیٹری نہ کلچرل پروگرام آپ نے ملک کا تبلیغی دورہ بھی نہ کیا۔ شاعری جو اس وقت کا بہترین ذریعہ نشرو اشاعت تھا اس کو بھی بروئے کار نہ لائے تاکہ اسلام یا نبوت شاعری نہ بن جائے۔ چالیس برس چپ رہے حالات کا اندازہ لگایا اور اسی اندازہ کے مطابق جرأت عمل کا ذخیرہ کیا۔ ۱۳ برس مکہ میں رہے جس کی ہر صبح و شام کو مصائب کا نیا طوفان اٹھتا تھا۔ مسلمان اتنا ستائے گئے کہ ستانے والے تھک گئے۔ قوت

برداشت کے جواب دینے سے پہلے حضورؐ نے ان کو حبشہ اور مدینہ کی پناہ گاہوں میں بھیج دیا۔ مدینہ میں دس سال زندہ رہے جس میں ۸۸ بار مسلح حملہ کا مقابلہ کیا۔ یعنی سالانہ ۹ حملوں کا دفاع آپ کا فریضہ رہا۔ آپ کی تنہا ذات میدان میں افواج کی کماندار بھی تھی اور مدینہ میں قاضی بھی۔ پوری فاقہ کش جماعت کی غذا و لباس کی ذمہ دار بھی۔ ۹ بیویوں کا خرچ اور ان کی کشاکش الگ، تبلیغ کی ذمہ داری الگ، طریقہ صرف احکام صادر کرنے کا نہ تھا بلکہ خود قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے حصہ کی خندق بھی کھودتے تھے۔ مسجد کی اینٹیں بھی اٹھاتے تھے۔ خدا سے وحی لے کر مسلمانوں کو یاد بھی کراتے تھے۔ اتنی مصروفیت میں بھی عبادت یوں کرتے تھے کہ خدا عبادت میں کمی کرنے کی فرمائش کرتا تھا۔ غرض کہ وسائل محدود، مشکلات عظیم، افکار کا ہجوم، صدمات پھر وہ بھی مسلسل ذاتی بھی اور قومی و دینی بھی، مقصد وسیع، مدت کم، طریقہ کار مشکل، انسانی صحت ہار جائے مگر حضورؐ نہیں ہارے اور وہ کر دیا جو مٹنے کے بعد بھی دنیا کے لیے واحد روشنی کا مینارہ ہے حضور کے آخری وقت درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے دنیا کو کیا بنانا چاہا تھا۔

انسانیت کی بہار

آمنہ کی گود میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے مشیت نے طے کیا تھا کہ آج کا بچہ ''گزشتہ زمانہ کا مصلح اور آئندہ زمانہ کا ہادی ہوگا'' جس نے زندگی کی کڑی دھوپ میں باپ کی محبت اور ماں کی شفقت کا سایہ بھی نہ پایا۔ جس نومولود کے لئے اوہام پرست اور بدشگونی پر اعتقاد رکھنے والوں کا عقیدہ تھا کہ یہ بچہ (معاذ اللہ) ''منحوس'' ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے باپ مر گیا۔ بچپنے میں ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ دادا بھی زیادہ زندہ نہ رہا۔ ''سبز قدمی'' جس کے لئے مشہور کی جارہی تھی اس کو خاندان کے بزرگ عبدالمطلب و ابو طالب نہ معلوم کن آنکھوں سے دیکھ کر فخر خاندان و نازش زمانہ سمجھ رہے تھے۔ ہوا بھی یہی کہ کل کا یتیم انسانی قوم کا باپ ثابت ہوا۔ بے سہارا جینے والا بے سہاروں کا مرکز زندگی نکلا۔ غریب شہر عزیز دہر ہوا مقصود اس وقت کا تذکرہ ہے جب انسانیت کو سنبھالنے والا اپنے جسمانی قدم سنبھال کر نہیں اٹھا سکتا بلکہ دو جوانوں (علی اور فرزند عباس) کے کاندھوں پر بوجھ دے کر گھر سے جس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے آنا چاہتا ہے مگر قدم نہیں اٹھتے بلکہ زمین پر گھسٹتے جاتے ہیں۔ علی و فاطمہ کو معلوم ہے کہ حضور اب موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ناتوانی رگوں میں دوڑ رہی ہے، منبر کی ایجاد کرنے والا منبر پر آخری بار جارہا ہے اور اس لیے جارہا ہے کہ آخری بار انسانوں کو

کردار کے ''عالمی انقلاب'' کی ''کلیدی بات'' کو ذہن نشین کرادے یعنی ''قانون کو ہر حال پر، ہر شخص پر، ہر جذبہ پر، ہر مصلحت پر بالا تر رکھنا'' نسل انسانیت کے لیے مکمل قانون آ چکا ہے لہٰذا اس میں ترمیم یا جدید تدوین کا بیکار کام نہ کرتا۔ حلال محمد حلال ہے قیامت تک کے لئے اور حرام محمد حرام ہے قیامت تک کے لیے کیونکہ ضرورت، مجبوری، معذوری کا مکمل جائزہ لے کر قانون میں ایسی لچک رکھی گئی ہے جو حالات پر حاوی ہے لہٰذا زمانہ کے تجدد کے باوجود یہ قانون بوسیدہ نہ ہوگا۔ اور جس طرح لاکھوں سال تک دنیا آباد ہے تو دو اور دو چار ہی رہیں گے اس میں نہ ترمیم ممکن ہے نہ تنسیخ کیونکہ دو اور دو چار ایک حقیقت ہے اور حقیقت بدلا نہیں کرتی اسی طرح حقائق کے خالق نے اپنے مکمل اور غیر تجرباتی علم سے جس قانون کی تشکیل کی ہے وہ بھی ناقابل ترمیم و تنسیخ ہے۔ جس قانون نے مخالف ماحول میں گرفتار شخص کو اپنے انکار کا حکم دیا ہو (تقیہ) اس میں ترمیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ قانون معذوروں کے لئے لچک رکھتا ہے لیکن حیلے بہانے اور من مانی کرنے کے لئے بیشک کوئی لچک نہیں رکھتا بلکہ ایسے مواقع پر قانون اسلام اپنے ماننے والوں سے اپنے لیے برتری کا مطالبہ کرتا ہے۔

غرض کہ حضورؐ نے تقریر کی جس کا خلاصہ میں نے اپنے الفاظ میں درج کیا ہے اور تقریر کے بعد قانون کی برتری و بالاتری کے لیے آپ نے کہا میری موت قریب معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی کا حق میرے ذمہ باقی ہو تو وہ طلب کر لے ایک شخص نے اٹھ کر کہا آپ کا ایک تازیانہ مجھے لگ گیا تھا جو آپ اونٹ کو مار رہے تھے اس کا بدلہ چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے ذہن سے اس صورت حال کو محسوس کریں کہ حضورؐ نے مطالبۂ حق دے کر بتایا کہ عرش الٰہی سے جس کی نعلین برتر رہیں وہ بھی قانون سے بالاتر نہیں بلکہ صاحب معراج نبی پر بھی قانون بالاتر ہے۔ اس سے زیادہ قابل توجہ یہ بات ہے کہ آپ نے ''قانون کی بالاتری'' کو اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ ایک کلمہ گو آپ سے تازیانہ کا انتقام لینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ تقریر پیغمبر سن کر اٹھنے والا شخص نہیں اٹھا تھا بلکہ عوام میں قانون کی بالاتری کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ تقریر نمائش نہ تھی لہٰذا حضور نے دعویٰ بلا دلیل مان لیا کیونکہ شخصیت کو بچانا مقصود نہ تھا بلکہ شخصیت پر قانون کو عملاً بالاتر ثابت کرنا تھا۔ قانون کتنی برتری حاصل کر چکا تھا کہ انتقام کا مطالبہ کرنے والا کہتا ہے کہ بدلہ تب لوں گا جب تازیانہ وہی ہو جو مجھے لگا تھا۔ حضور کا تازیانہ آپ کی اکلوتی بیٹی فاطمہ کے پاس تھا۔ سلمان تازیانہ لینے بھیجے گئے اور انھوں نے جانے سے انکار نہیں کیا بلکہ چلے کیونکہ آپ صرف صحابی نہ تھے بلکہ ''رفیق مقصد'' تھے۔ جناب فاطمہ نے پوچھا

کہ بابا سفر میں جاتے وقت تازیانہ لیتے تھے آج کیوں مانگا ہے جب کمزوری ایک قدم نہیں اٹھانے دیتی ہے سلمان نے پورا واقعہ بتایا۔ بنی نے تازیانہ لاکر دے دیا یعنی جذبات اور محبت اور رشتہ پر قانون نے بالاتری حاصل کی۔ فاطمہ کو باپ سے بے انتہا محبت کے باوجود تازیانہ دینے میں ہچکچاہٹ نہ ہوئی کیونکہ آپ صرف ''رسول زادی'' نہ تھیں بلکہ جزو نبوت اور شریک کار رسالت تھیں۔ بھرے مجمع میں تازیانہ آیا۔ انتقام لینے والے کو دیا گیا۔ وہ تازیانہ لے کر اٹھا منبر تک آیا علی، سلمان، ابوذر، عمار یاسر اور باقی مسلمان اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ مادی آنکھیں منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاکر بند ہوجانا چاہتی ہیں مگر بصیرت کو آنکھوں کے سامنے ہدایت کا عالم تاب چہرہ بے نقاب آرہا ہے۔ بدلہ لینے والے نے منبر کے پاس رک کر کہا کہ جب تازیانہ لگا تھا میں برہنہ تھا حضور بھی کرتا اتار دیں۔ حضورؐ نے اپنے جسم سے پیراہن اتارا اور انسانیت کو پہنادیا۔ دل سینوں میں قریب تھا کہ پھٹ جائیں جب بدلہ لینے والا تازیانہ لے کر منبر پر چڑھ رہا تھا۔ ابر سے آفتاب جس طرح ایک دم سے نکل آتا ہے اسی رفتار سے منظر اچانک بدلا اور تازیانہ مارنے والا تازیانہ مارنے کے بجائے مہر نبوت کو بوسہ دے رہا تھا۔ اور کانوں سے صدا ٹکرا رہی تھی۔ ''میں نے مہر نبوت کا بوسہ لینے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی تھی''۔ مسلمان کھل اٹھے۔ کشت انسانیت لہلہا اٹھی مشیت مسکرا رہی تھی۔ رحمت جھوم رہی تھی قانون کی بالاتری زندہ جاوید بن چکی تھی۔ دور اور بہت دور شیطان کی سسکیاں بھی سنی جاسکتی تھیں ابھی سینوں میں دلوں کو قرار نہ ملا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری موت قریب ہے کسی کو کوئی حاجت ہو تو بتائے تاکہ اس کی حاجت برآری کے لیے دعا کردوں۔ وہ عرب جو دولت کے لالچی، حکومت و اقتدار کے بوالہوس، دنیاوی تمناؤں کے اسیر تھے ان کے کانوں سے حضور کی یہ صدا ٹکرائی۔ وہ عرب اب بھی تھے مگر مسلمان تھے یعنی انسان تھے۔ لہٰذا دنیا کے بجائے دینی حاجتیں بیان ہونا شروع ہوئیں ایک شخص نے کہا میں منافق ہوں میرے لیے ایمان کی دعا فرمائیں۔ اعتراف کی تاریخ ایسی لطیف مثالوں سے خالی ہے یا ایسی مثالیں پھر خال خال ملتی ہیں۔ حضورؐ نے اس کے لئے دعائے ایمان فرمائی۔ دوسرا شخص اٹھا۔ اس نے کہا مجھے نیند زیادہ آتی ہے۔ عبادت سے محروم رہتا ہوں۔ زبان جھوٹ کی عادی ہے بے اختیار جھوٹ بولتا ہوں، منافق ہوں۔ ''عیوب ثلاثہ'' سے نجات کی دعا فرمائی حضرت عمر سے نہ رہا گیا۔ فرمایا تم نے اپنے کو رسوا کرلیا حضورؐ نے آپ کو ڈانٹا کہ چپ رہو۔ اس کی جرأت اعتراف لائق صد ستائش ہے۔ یاد رکھو آخرت کی رسوائی سے دنیا کی رسوائی بہت آسان ہے

پھر آپ نے دعا فرمائی منبر سے اترے۔ چند دن کے بعد حضورؐ زمین پر نہ مٹنے والا اجالا چھوڑ کر آغوشِ زمین میں پنہاں ہوگئے۔ رسول کا سفر ختم ہوا۔ امت کا سفر شروع ہوا جو حوضِ کوثر پر ختم ہوگا۔ جہاں حضورؐ ہم سے اپنی عظیم امانت اسلام اور اس کے امانتدار اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں پوچھیں گے۔ صدیق و امین نبی کے پاس اسی کو جگہ ملے گی جس نے آپ کی امانتوں میں خیانت نہ کی ہوگی۔